علم

انسانیت کی ضرورت

تالیف

مولانا سید بلال حسنی ندوی

ایچ، ایم، حسین ٹرسٹ

H. M. Husain Trust

Email: hmhamuwash@yahoo.com

Cell: +91 7095168679

Front_1

طبع اول

محرم الحرام ۱۴۳۹ھ - اکتوبر ۲۰۱۷ء

نام کتاب :	علم: انسانیت کی ضرورت
مؤلف :	مولانا سید بلال حسنی ندوی
صفحات :	۱۶
تعداد :	۲۰۰۰
باہتمام :	انجینیر محمد عثمان حیدر آبادی
قیمت :	ہدیہ منجانب، ہچ، یم حسین ٹرسٹ

انتساب

والدین ماجدین

مولانا سید بلال حسنی ندوی

ملنے کے پتے

مجلس تحقیقات ونشریات اسلام، لکھنؤ۔ 2741539 -0522

دارعرفات، تکیہ کلاں رائے بریلی۔ 09807240512

ناشر

ہچ، یم، حسین ٹرسٹ

H. M. Husain Trust

Email: hmhamuwash@yahoo.com

Cell: +91 7095168679

Elm Ins

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

انسانی سماج میں علم کی اہمیت اور فرض منصبی

انسانی سماج کے لیے علم کی اہمیت آج ایک تسلیم شدہ حقیقت ہے، لیکن اس کا آوازہ سب سے پہلے اسلام نے بلند کیا، نبی آخر الزماں ﷺ پر سب سے پہلی وحی میں علم کی طرف توجہ دلائی گئی اور پڑھنے کا حکم دیا گیا اور قلم کا تذکرہ کیا گیا، ارشاد ہوا:

"اقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِيْ خَلَقَ، خَلَقَ الْإِنسَانَ مِنْ عَلَقٍ، اقْرَأْ وَرَبُّكَ الْأَكْرَمُ، الَّذِيْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ، عَلَّمَ الْإِنسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ" [العلق:۱-۵] (پڑھئے اپنے اس پروردگار کے نام سے جس نے پیدا کیا، جس نے انسان کو خون کے ایک لوتھڑے سے بنایا، پڑھتے جایئے اور آپ کا پروردگار سب سے زیادہ کرم والا ہے، جس نے قلم سے علم سکھایا، انسان کو وہ سکھایا جو وہ جانتا نہ تھا)۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ دین اسلام میں علم کی خاص اہمیت ہے، لیکن علم کے لیے یہ شرط ہے کہ اس کا رشتہ اللہ تبارک وتعالیٰ کے نام کے ساتھ مربوط ہو، یہی وجہ ہے کہ اس امت کا علم سے بہت گہرا و مضبوط تعلق رہا ہے، علوم وفنون کے استحکام وترقی کی شاہ کلید تو قرآن مجید کی یہ پہلی آیت ہے جس سے وحی کا آغاز ہوتا ہے، سب سے پہلے اس میں پڑھنے ہی کا حکم دیا گیا ہے، اور قلم کا تذکرہ کیا گیا ہے، حضور ﷺ نے تعلیم وتعلم کی بڑی اہمیت بیان فرمائی ہے، بدر کے قیدیوں کا یہی فدیہ متعین کیا گیا تھا کہ ان میں جو پڑھے لکھے ہوں وہ بچوں کو تعلیم دیں، آپ ﷺ نے بعض صحابہ کو عبرانی اور دوسری زبانیں سیکھنے کا بھی حکم فرمایا تھا، تمام مذاہب میں اسلام نے علم کی اہمیت جس طرح اجاگر کی ہے اور اس کو طاقت بہم

Back_1

پہنچائی ہے، دنیا کا کوئی مذہب اس کا عشر عشیر پیش کرنے سے قاصر ہے، حضور ﷺ کے دور ہی سے علم کی ترقی کا سلسلہ شروع ہوا اور آپ ﷺ نے علم کے جو بنیادیں فراہم کیں، بعد میں اس پر بڑے بڑے محلات اور فلک بوس عمارتیں تعمیر ہوئیں، اور واقعہ یہ ہے کہ اسلام نے جس طرح دنیا کو علم سے بھر دیا اس کی نظیر کسی دوسرے مذہب یا مکتب فکر میں نہیں ملتی، اسلام کا یہ بھی امتیاز ہے کہ اس نے صحیح بنیادوں پر علم کو آگے بڑھایا، اور اس کے ساتھ عظمت رب شامل کی، پہلی ہی وحی میں "اِقْرَأْ" (پڑھئے) کے ساتھ "بِاسْمِ رَبِّكَ" (اپنے رب کے نام سے) کی شرط لگا دی گئی تا کہ انسان بے مہار نہ ہو اور علم کا استعمال بے جا نہ ہو سکے۔

عرصہ دراز تک تمام علوم کی زمام مسلمانوں کے ہاتھ میں رہی، اور انسانیت کو ان علوم سے کما حقہ نفع حاصل ہوتا رہا، کیونکہ ان کے پاس علم کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے بیان کردہ وہ احکامات بھی تھے، جن میں انسانیت کا درس دیا گیا ہے، اور وہ نظام اخلاق بھی تھا جو آنحضور ﷺ کی سیرت طیبہ کا عکس ہے، تاریخ میں آتا ہے کہ جس وقت بغداد میں مسلمانوں کی حکومت تھی، وہاں خدمت خلق کے لیے بڑے بڑے ہاسپٹلس قائم تھے، انہیں میں ایک بہت بڑا ہاسپٹل "بیمارستان" کے نام سے تھا، اس میں مختلف ڈپارٹمنٹس قائم تھے، انہیں میں ایک ایسا ڈپارٹمنٹ بھی تھا، جس میں باقاعدہ کچھ لوگوں کو اس غرض سے رکھا جاتا تھا کہ وہ مریض کے کمرہ کے آس پاس بیٹھ کر اس کے متعلق ایسی باتیں کریں جن سے اس کو نفسیاتی طور پر تقویت حاصل ہو، لیکن آج اس کے بالکل برعکس نظر آتا ہے، اب حالت یہ ہے کہ اگر کوئی مریض ڈاکٹر کے پاس Checkup کے لیے جائے، تو بجائے اس کے کہ رپورٹ دیکھنے کے بعد ڈاکٹر تسلی کے چند کلمات کہے، اس کو سخت تشویش میں ڈال دیتا ہے، بسا اوقات ایسے سخت کلمات بھی زبان سے کہہ دیتا ہے جن کو سن کر مریض کی طبیعت میں اچانک گراوٹ پیدا ہو جاتی ہے، اس کا سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ علم ہے لیکن علم کی روح نہیں ہے، ٹیکنالوجی میں انسان آسمان کی بلندیوں کی طرف جا رہا ہے مگر اخلاق میں اس کی سطح

Elm In

بعض مرتبہ جانوروں سے بھی نیچے نظر آتی ہے، چونکہ مسلمانوں کے پاس علم کے ساتھ اخلاقی نظام بھی تھا، اس لیے ان کے یہاں ایسی سوہان روح حرکتیں نہیں تھیں، بلکہ انہوں نے اس بات کی کوشش کی کہ علم کو زیادہ سے زیادہ اخلاقیات سے مربوط کیا جائے، تاریخ میں اس قبیل کی بے شمار مثالیں موجود ہیں، جن کے مطالعہ سے حیرت ہوتی ہے کہ مسلمانوں نے علم کو کس حد تک ترقی دی تھی اور عالم انسانیت کو اس سے کس قدر فائدہ پہنچا تھا۔

علم نافع یا غیر نافع

حاصل یہ کہ جب تک مسلمانوں کے ہاتھ میں علم رہا اس وقت تک علم ساری دنیائے انسانیت کے لیے باعث رحمت تھا، مسلمانوں نے علم کے ذریعہ صرف یہی نہیں کہ محض علمی فائدہ اٹھایا، بلکہ تجرباتی طور پر انسانیت کو بیش قیمت تحفے دیئے، اخلاقی طور پر اس کے لیے ایسے حدود قائم کیے جس کی بنیاد پر کوئی شخص علم کا Misuse نہ کر سکے، یعنی اس کا غلط استعمال نہ ہو، اس کی افادیت کے دروازے بند نہ کیے جائیں، اس سے دوسروں کو فائدہ پہنچایا جائے، اسی لیے حدیث میں آتا ہے: "من کتم علماً یلجم بلجام من نار" [صحیح ابن حبان: ۹۵] (جو علم کو چھپائے گا اس کو آگ کی لگام لگائی جائے گی)۔

یہاں یہ بات ذہن نشیں رہے کہ ہر علم نافع ہے، کوئی بھی علم غیر نافع نہیں، لیکن علم غیر نافع اور مضر اس وقت ہوتا ہے جب وہ ان ہاتھوں میں پہنچ جائے جو اس کا غلط استعمال کرتے ہوں، ان کے غلط استعمال سے اس علم کے نامناسب مظاہر معاشرہ میں رونما ہوتے ہیں، پھر یہ کہا جاتا ہے کہ علم نقصان پہنچا رہا ہے، حالانکہ علم نقصان نہیں پہنچاتا، علم فائدہ ہی پہنچاتا ہے، لیکن جو لوگ اس کا استعمال کرتے ہیں اس سے فرق پڑتا ہے، کوئی اس سے فائدہ اٹھاتا ہے فائدہ پہنچاتا ہے، کوئی اس سے فائدہ اٹھاتا ہے نقصان پہنچاتا ہے، کوئی اس سے خود بھی نقصان اٹھاتا ہے اور ساری انسانیت کو نقصان پہنچاتا ہے، اور کوئی اس سے نہ خود

فائدہ اٹھاتا ہے، نہ فائدہ اٹھانے دیتا ہے۔

آگ جلاتی ہے اس کا علم اپنی جگہ مفید ہی ہے، مگر کوئی اس کا استعمال کھانا پکانے کے لیے اور چراغ روشن کرنے کے لیے کرتا ہے، فائدہ اٹھاتا ہے اور فائدہ پہنچاتا ہے، اور کوئی اس کا استعمال کسی کا گھر جلانے اور کسی کو تباہ کرنے کے لیے کرتا ہے، علم اپنی جگہ مفید تھا مگر اس کے غلط استعمال نے اس کو بگاڑ دیا، پانی سے پیاس بجھتی ہے، ایک انسان اس کا علم رکھتا ہے مگر وہ خود نہ اپنی پیاس بجھاتا ہے، اور نہ دوسرے کی پیاس بجھنے دیتا ہے، البتہ یہ نافعیت دنیا کے اعتبار سے بھی ہے، اور آخرت کے اعتبار سے بھی، دنیا و آخرت کی کامیابی کے طریقے اس سے معلوم ہوتے ہیں، پھر آدمی ان طریقوں سے فائدہ نہ اٹھائے، اور دوسروں کو نہ بتائے تو ایسے ہی علم سے پناہ مانگی گئی ہے:

"اللّٰھم إنی أعوذ بك من علم لا ینفع" [سنن ابن ماجہ:۲۵۸] (اے اللہ! میں ایسے علم سے تیری پناہ چاہتا ہوں جو فائدہ نہ دے)۔

علم کا کام فائدہ پہنچانا تھا، اب اگر اس سے فائدہ نہ اٹھایا جائے اور اپنی زندگی کی گاڑی اس کی روشنی میں صحیح رخ پر نہ لائی جائے تو ایسے علم کا کیا حاصل؟.....اس لیے اس علم سے پناہ مانگی گئی ہے۔

افسوس کا مقام ہے کہ جن مسلمانوں نے علم سے غیر معمولی فائدہ اٹھایا، اور پوری انسانیت کو ایسے تحفے دیے جن کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا، آج انہیں مسلمانوں نے علم سے اپنا رشتہ توڑ لیا، نتیجہ یہ ہوا کہ علم ایسے لوگوں کے ہاتھوں میں چلا گیا جو اخلاق سے نا آشنا تھے، انسانیت کے درد سے ناواقف تھے، صحیح فہم سے دور تھے، جن کو اس بات کا بھی شعور نہ تھا کہ ایک انسان کے اندر کیسا دھڑکتا ہوا دل ہوتا ہے، آپس میں کیسی محبتیں ہوتی ہیں، اور ایک انسان دوسرے انسان کو فائدہ پہنچا کر کیسا سکون محسوس کرتا ہے، یہ سب وہ چیزیں ہیں کہ علم جن قوموں کے ہاتھ میں گیا وہ ان تمام باتوں سے ناواقف تھیں، یہی وجہ ہے کہ گرچہ ان

قوموں نے علم، سائنس اور ٹیکنالوجی کے میدان میں ترقی کی، مگر ان علوم کو اخلاق کی وہ روشنی نہ ملی جن سے انسانیت نوازی کا کام ہوتا، نتیجہ یہ ہوا کہ ٹیکنالوجی کے میدان میں ترقی کی بنیاد پر ایسے بم ایجاد کیے گئے جن سے پوری انسانیت خطرہ میں ہے، ماہرین کا کہنا ہے کہ ان بموں میں سات مرتبہ دنیا تباہ کرنے کی صلاحیت ہے۔

دیگر مذاہب کی علم سے دوری

بعثت سے پہلے کی تاریخ کا مطالعہ کرنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس وقت کے بڑے بڑے مذاہب بھی علم سے کوسوں دور تھے، عیسائیت، یہودیت یا بعض دوسرے ایسے خود ساختہ مذاہب جن کی کوئی حقیقت نہ تھی، ان کا جائزہ لینے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان تمام مذاہب میں علم کا فقدان تھا، آج یہودی اور عیسائی سب سے زیادہ ترقی یافتہ و تعلیم یافتہ سمجھے جاتے ہیں، تعلیم کی باگ ڈور انہیں کے ہاتھ میں ہے، واضح رہے کہ یہ صورت حال ہمیشہ سے نہیں تھی، بلکہ تاریخ کا جائزہ لینے سے معلوم ہوتا ہے کہ آج سے تقریباً آٹھ سو سال پہلے پورا یورپ تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا، خود مغربی مفکرین اپنے اس جاہلی دور کو Dark Ages (تاریک صدیاں) سے ہی تعبیر کرتے ہیں، رابرٹ بریفالٹ (Robert Briffault) لکھتا ہے:

''پانچویں صدی سے لے کر دسویں صدی تک یورپ پر گہری تاریکی چھائی ہوئی تھی اور یہ تاریکی تدریجاً زیادہ گہری اور بھیانک ہوتی جارہی تھی.....اٹلی اور فرانس جیسے شہروں میں طوائف الملوکی اور ویرانی کا دور دورہ تھا''۔ (عروج و زوال کا اثر، صفحہ: ۳۸، بحوالہ کتاب The Making Of Humanity)۔

یہ وہ زمانہ تھا جس میں ان کے پاس علم کی کوئی روشنی نہیں تھی، یہ آخری درجہ کی بات ہے کہ ان کو اپنے مذہبی لوگوں (پوپ یا پروہت) کی طرف سے علم حاصل کرنے کی کوئی اجازت نہ تھی، ان کی علم دشمنی کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ اگر ان میں کوئی

شخص علم حاصل کرتا تو اس کو سخت سزائیں دی جاتیں، اس کا نتیجہ یہ تھا کہ ان کے یہاں کسی قسم کا علم موجود نہ تھا، یہی وجہ ہے کہ اگر ان لوگوں میں کوئی شخص بیمار ہو جاتا تو اس کو کسی جنگل میں یہ سمجھ کر ڈال دیتے کہ اگر اس کو اچھا ہونا ہے تو اچھا ہو جائے گا، ورنہ مر جائے گا، گویا علم سے دوری کے سبب ان کے پاس ایسا کوئی طریقۂ علاج نہ تھا جس سے وہ مریضوں کا علاج کر سکیں، یہ دین اسلام ہی کی خصوصیت ہے کہ اس نے اپنے ماننے والوں کو پہلے دن سے علم کی طرف توجہ دی، جس کے نتیجہ میں مسلمانوں نے علم میں ترقی کی، اور مختلف علوم وفنون وجود میں آئے۔

تاریخ سے ناواقفیت کا نتیجہ

موجودہ دور میں تاریخ سے واقفیت نہ رکھنے والے طبقہ کی سوچ یہ ہے کہ یورپ کو یہ ترقیاں شروع سے حاصل رہی ہیں، جب کہ حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے، ہر میدان میں تمام علوم کی کمان مسلمانوں کے ہاتھ میں تھی، اس لیے کہ ان کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے پہلی ہی وحی میں علم سے رشتہ مضبوط کرنے کا حکم دیا گیا تھا، یہی وجہ ہے کہ اس کے بعد بے شمار علوم وجود میں آئے، جن کا شاید اس سے پہلے دنیا نے تصور بھی نہ کیا ہو، امویوں اور عباسیوں کے زمانہ کی تاریخ کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ آج سائنس، طب، جغرافیہ، ریاضیات، فلکیات وغیرہ نہ جانے کتنے علوم جن سے ساری دنیا فائدہ اٹھا رہی ہے، ان میں مسلمانوں نے بنیادی طور پر ایسی معلومات فراہم کی تھیں، یا بالفاظ دیگر مسلمانوں نے ان کی ایسی بنیادیں رکھ دی تھیں کہ آج فلک بوس عمارتیں انہیں بنیادوں پر تعمیر ہو رہی ہیں، اور دنیا کی آنکھیں ان سے خیرہ ہو رہی ہیں، لیکن دنیا اس حقیقت سے واقف نہیں کہ یہ عمارتیں کن بنیادوں پر تعمیر کی جا رہی ہیں، جب کہ خود مغربی مفکرین نے اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ اگر مسلمانوں نے علوم میں ترقی نہ کی ہوتی، ہمیں یہ بنیادیں نہ دی

ہوتیں، تو ہم کم از کم تین سو سال پیچھے ہوتے، اس اعتراف کی روشنی میں اگر آج سے تین سو سال پہلے کی حالت کا جائزہ لیا جائے، تو اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ آج کے مقابلہ میں پچھلی صدیوں میں نہیں بلکہ چند سال قبل تک دنیا ترقی کی راہوں سے کس قدر دور تھی، آج ہر جیب میں موبائل نظر آتا ہے، پچیس یا پچاس سال پہلے کی بات ہے کہ کسی شخص کے خیال میں بھی یہ بات نہ تھی کہ اس کی جیب میں موبائل ہوگا، اسی طرح اس سے بھی پہلے کا زمانہ دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس وقت دنیا مزید پیچھے تھی، بسا اوقات ایسا بھی ہوا کہ علوم میں ترقی نہ ہونے کی وجہ سے بہت سے ان لوگوں کو بعض قرآنی آیات میں اشکال پیدا ہوا، جو ہر چیز کے سمجھنے میں عقل کو مقدم رکھتے ہیں، مشہور ہے کہ سرسید احمد خاں مرحوم کو اس سلسلہ میں ایک بہت بڑی غلط فہمی ہوئی کہ قرآن مجید میں حضرت سلیمان علیہ السلام کے بارے میں فرمایا گیا:

"وَلِسُلَيْمَانَ الرِّيْحُ غُدُوُّهَا شَهْرٌ وَرَوَاحُهَا شَهْرٌ" [سبا:۱۲] (اور (ہم نے) سلیمان کے لیے ہوا (کو مسخر کیا) اس کا صبح کا سفر بھی ایک مہینہ (کی مسافت) کا ہوتا تھا اور شام کا سفر بھی ایک مہینہ (کی مسافت) کا)۔

یعنی حضرت سلیمان علیہ السلام مہینہ کی مسافت گھنٹوں میں طے کر لیتے تھے، سرسید احمد خاں مرحوم کو یہ بات سمجھ میں نہ آئی، لہٰذا اس کا انکار کر بیٹھے، لیکن جب اس کے بعد جہاز ایجاد ہوا، تو لوگوں نے یہ بات کہی کہ کاش آج سرسید مرحوم زندہ ہوتے اور لمبی مسافت کو کم وقت میں طے کرنے کی یہ عملی شکل ان کے سامنے آجاتی تو شاید وہ اس کا انکار نہ کرتے۔

منحوس ترین دن

مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ نے لکھا ہے کہ جس وقت عیسائیوں کے ہاتھ میں علم کی کمان گئی شاید وہ دن دنیا کے لیے منحوس ترین دن تھا، جس کی وجہ یہ ہے کہ عیسائی علم کے دشمن تھے، اوپر بیان کیا جاچکا ہے کہ ان کے یہاں حصول علم کی مذہبی طور پر سخت ممانعت

تھی، یہ آخری درجہ کی بات ہے کہ جب ان میں کسی شخص کے متعلق یہ معلوم ہوتا کہ وہ علم حاصل کر رہا ہے تو اس کو زندہ جلا دیا جاتا، اس سے بڑھ کر یہ کہ اگر کسی مرے ہوئے شخص کے بارے میں معلوم ہوتا کہ اس نے تعلیم حاصل کی تھی، تو اس کی قبر سے ہڈیاں نکال کر جلائی جاتیں، تاکہ تمام لوگوں کو عبرت حاصل ہو، لیکن چونکہ عیسائیوں کو صلیبی جنگوں میں مسلمانوں سے مستقل شکست کا سامنا کرنا پڑا، اس لیے ان کے بادشاہ لوئس نہم نے مصر کے قید خانہ میں اپنی قوم کو یہ وصیت لکھی کہ اگر مسلمانوں سے مقابلہ کرنا ہے تو اس کا صرف ایک راستہ ہے اور وہ یہ ہے کہ علم کے میدان میں ترقی کی جائے، اور اس کی کمان اپنے ہاتھ میں لی جائے، چنانچہ ساتویں صدی ہجری میں اس وصیت کو مدنظر رکھتے ہوئے ان کے بعض مفکرین نے اپنے مذہبی پیشواؤں سے حصول علم کی اجازت لی، جن میں ریمن لل (Raman Lull) اور روجر بیکن (Roger Bacon) (۱۲۹۴-۱۲۱۴ء) خاص طور پر قابل ذکر ہیں، اجازت لینے کے بعد حصول علم کے لیے اندلس گئے، اور پھر جو کچھ انہوں نے سیکھا وہ لے کر آئے اور اپنی قوم میں انہوں نے اس کو عام کرنے کی ہر ممکن کوشش کی، یہ بھی اللہ تعالیٰ کا نظام وقانون ہے کہ جو قوم محنت کرتی ہے، اس کو اس کا صلہ دیا جاتا ہے، عیسائیوں نے علم پر محنت کی اور مسلمانوں نے اس سے بے اعتنائی برتی، اس لیے رفتہ رفتہ علم کی کمان ان ہاتھوں میں پہنچ گئی جن کا تعلق صرف علم سے تھا، اخلاقیات سے نہیں، کیونکہ ان لوگوں نے علم کو اللہ کے نام کے ساتھ مربوط نہیں کیا تھا، اور یہ علمی ترقی مذہب دشمنی کے ساتھ مربوط تھی، حکومت وکلیسا کی طویل کشمکش اور بالآخر مذہب کی شکست کے بعد ترقی کا سلسلہ آگے بڑھا تھا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ علم تمام دنیا کے لیے راحت کا ذریعہ بننے کے بجائے انسانیت کے لیے نقصان کا سبب بن گیا، یہ الگ بات ہے کہ اس علمی ترقی کی بنیاد پر دنیا کو بہت سی راحت کی چیزیں بھی حاصل ہوئیں، لیکن اسی کے ساتھ علم کا غلط استعمال بھی ہوا، اس کی وجہ صرف یہی تھی کہ وہ اخلاق وانسانیت سے خالی تھے، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایٹم بم ایجاد ہوئے، اور ان کا غلط استعمال کیا گیا، جاپان کے دو شہروں میں ایسے مہلک

بم پھینکے گئے کہ کئی لاکھ لوگوں کی جان گئی، انسائیکلو پیڈیا آف برٹانیکا میں اس حادثہ کا مفروضہ بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ کئی کروڑ لوگوں کی جان بچانے کے لیے پانچ لاکھ لوگوں کی جان لی گئی، گویا اگر وہاں بم نہ گرایا جاتا تو ممکن تھا کہ بہت لوگ مرجاتے، لہٰذا ایک شک کی بنیاد پر کئی لاکھ لوگوں کی جان لینا مناسب معلوم ہوا۔ (العیاذ باللہ)

موجودہ نصاب ونظام تعلیم

افسوس کی بات یہ ہے کہ وہی نظام تعلیم جو ہر طرح کے اخلاق وانسانیت سے عاری ہے آج ساری دنیا میں رائج ہے، حالانکہ یہ سامراجی نظام کی یادگار ہے، برطانیہ اور فرانس کے سامراجی دور میں انہوں نے اپنے جس نظام اور نصاب تعلیم کو مشرقی ملکوں میں تھوپا تھا، آج افسوس کی بات یہ ہے کہ ظاہری طور پر سامراج ختم ہونے کے باوجود بھی اکثر ملکوں میں وہی نظام جاری ہے، ان ملکوں کو اس بات کی قطعاً کوئی فکر نہیں کہ وہ خود اپنا نصاب تعلیم تیار کریں، اپنی آزادی کا ثبوت دیں، ہمارے ملک ہندوستان کی بھی بعینہٖ یہی صورت حال ہے، یہاں کے باشندوں کو اب تک یہ ہوش نہیں کہ وہ اس ملک کی تہذیب، یہاں کے قد وقامت کے لحاظ سے ایک نصاب تعلیم تیار کریں، ایسا نظام تعلیم ترتیب دیں جو اس ملک کے لیے مناسب حال ہو، جس میں انسانیت واخلاق کی قدریں ہوں، اور اس نظام میں ڈھلنے والا ایک اچھا انسان بن سکے، اس سے بڑھ کر افسوس ان مسلمان ملکوں پر ہے، جہاں اس سلسلہ کی کوئی کوشش نہیں کی گئی، جب کہ اس کی ضرورت نہ جانے کب سے محسوس ہو رہی ہے، مفکر اسلام حضرت مولانا علی میاں ندویؒ نے نہایت پرزور طریقہ پر اس ضرورت کو پورا کرنے کی دعوت دی، جگہ جگہ یہ بات کہی کہ آج مسلمان ملکوں اور تمام مسلمانوں کے اوپر یہ ایک بہت بڑی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنا نظام ونصاب تعلیم تیار کریں، ایسا نصاب تعلیم جو ان کے عقائد واخلاق کے مناسب حال ہو، تاکہ کسی بھی طرح کی آپسی کشمکش پیدا نہ ہو، اس لیے کہ جب کشمکش پیدا ہوتی ہے تو اس کے نتیجہ میں

صلاحیتیں ضائع ہوتی ہیں، عالم اسلام کے حکمراں طبقہ اور عوام میں کشمکش پیدا ہونے کا سب سے بڑا سبب نظام تعلیم کی خامیاں اور کمزوریاں ہی ہیں، جو آج تک ان ملکوں میں پائی جاتی ہیں، افسوس کی بات ہے کہ ہمارے اس ملک میں بھی وہی خامیاں موجود ہیں، ضرورت اس بات کی تھی کہ موجودہ نصاب تعلیم میں بعض ایسی تبدیلیاں کی جاتیں، جو اس ملک کے لیے مفید ہوتیں، مگر طرفہ تماشہ یہ کہ آج یہاں کے نصاب تعلیم میں ایسی تبدیلیاں کرنے کی کوششیں جاری ہیں، جو تبدیلیاں اس ملک کے لیے سخت خطرہ بن سکتی ہیں، اس کا ڈر ہے کہ اس کے نتیجہ میں یہاں کی آبادی کے اندر آپس میں ایک ایسی خلیج پیدا ہو جائے جس خلیج کو پاٹا نہ جا سکے، اور اس کی وجہ سے ملک کی ترقی کی تمام راہیں مسدود ہو جائیں، واقعہ یہ ہے کہ اس وقت جو نظام اور نصاب تعلیم مرتب کیا جا رہا ہے، اس میں ایسی ہی چیزیں مزید داخل کی جا رہی ہیں جس کے نتیجہ میں بڑا انتشار پیدا ہو سکتا ہے۔

مسلمانوں کی ذمہ داری

یہ ذمہ داری سب سے بڑھ کر مسلمانوں کی ہے کہ وہ ایسا نصاب تعلیم تیار کریں جو یہاں کی آبادی کے لحاظ سے موزوں ہو، خاص طور پر مسلمانوں کے عقائد اور نظام اخلاق و عبادات کے اعتبار سے مکمل ہو، ایک طرف اس کا پڑھنے والا زمانہ کے تقاضوں کو پورا کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو، دوسری طرف وہ پورا مسلمان بھی ہو، یعنی عقائد مضبوط ہوں، اخلاقیات سے واقف ہو، اس کے بعد خواہ وہ انجینئر بنے یا ڈاکٹر، یا اس کے علاوہ کسی بھی شعبہ زندگی کو اختیار کرے، اس کا طرۂ امتیاز یہی ہو کہ وہ سب سے پہلے ایک پختہ مسلمان ہو، اس کے ساتھ ساتھ اس کے اندر وہ تمام صلاحیتیں بھی موجود ہوں جو اعلیٰ سے اعلیٰ اسکول میں تعلیم پانے والے کے اندر ہو سکتی ہیں، تاکہ علم اور اسم الٰہی کے مضبوط تعلق کے اس خلا کو پر کیا جا سکے جو صدیوں سے چلا آ رہا ہے، لیکن آج مسلمانوں کا المیہ یہ ہے کہ ہمارے بچے

ہندوؤں یا عیسائیوں کے اسکولوں اور کالجوں میں جاتے ہیں، جہاں ان کے عقیدہ کو کھوکھلا کیا جاتا ہے، دیومالائی نظام پڑھایا جاتا ہے، اسی لیے موجودہ حالات میں مسئلہ صرف عمل کا نہیں رہ گیا، بلکہ مسئلہ عقیدہ کا ہے، آج مسلمان بچوں کو عقیدہ کے اعتبار سے ایسی مہلک باتیں بتائی جارہی ہیں، اور عملی طور پر ایسی شکلیں اختیار کرائی جارہی ہیں، جن کے بعد ان کو مسلمان کہنا بھی مشکل ہے، ضرورت اس بات کی ہے کہ ان حالات میں اپنا نصاب تعلیم تیار کیا جائے، اسلامک اسکول قائم کئے جائیں، چونکہ یہ کام دیرطلب ہے، لہٰذا ہر مسلمان کے لیے فوری طور پر ضروری ہے کہ وہ طے کرلے کہ ہمارے جو بچے اسکولوں یا کالجوں میں جارہے ہیں، ان کو دینیات کی تعلیم دلانا ہے، یعنی عقائد کی اصلاح کے لیے، قرآن مجید پڑھانے کے لیے، دینی تعلیم دینے کے لیے صباحی و مسائی مکاتب کا انتظام کرنا ہے، یہ ہمارے اوپر ایک ایسا فریضہ ہے کہ اگر خدانخواستہ ہم نے فوری طور پر اس کو ادا نہ کیا تو اس بات کا ڈر ہے کہ ہماری آنے والی نسل عقیدہ کے ارتداد کا شکار نہ ہوجائے، موجودہ حالات میں مسئلہ عملی یا فکری ارتداد کا نہیں بلکہ عقیدہ کے ارتداد کا ہے، آج عیسائی اسکولوں میں جانے والے مسلمان بچوں کے ذہن و دماغ میں یہ بات راسخ کرائی جارہی ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام خدا کے بیٹے اور خدائی میں شریک تھے، ہندو اسکولوں میں جانے والے بچوں کو دیومالائی نظام پڑھایا جارہا ہے، اسی نہج پر ان کی تربیت بھی کی جارہی ہے، لیکن افسوس کی بات ہے کہ ہم ان تمام باتوں سے بالکل بے خبر ہیں۔

غفلت کا نتیجہ

ایک صاحب جو بڑے دین دار ہیں، انہوں نے بیان کیا کہ ہماری بچی اسکول میں جاتی تھی، ایک مرتبہ اسکول لے جانے کے لیے رکشہ نہیں آیا، ہم اپنی گاڑی سے اس کو اسکول چھوڑنے گئے، راستہ میں ایک مندر گذرا، جس کو دیکھ کر اچانک ہماری بچی اپنے ہاتھ

جوڑ کر کھڑی ہوگئی، ہم نے معلوم کیا: تم یہ کیا کر رہی ہو؟ اس نے جواب دیا: ہماری استانی نے بتایا تھا کہ یہ جگہیں بڑی مقدس ہوتی ہیں، اگر راستہ میں کوئی مسجد، مندر یا کلیسا آجائے تو فوراً ہاتھ جوڑ لینا چاہئیں، اس کے ذریعہ خدا کی مدد ہوتی ہے، اور وہ راضی ہوتا ہے، واقعہ یہ ہے کہ اس طرح کے واقعات ایک دو نہیں بلکہ دسیوں ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ ہماری غفلت کے سبب ہمارے بچے اسلامی عقائد سے دور ہوتے جارہے ہیں۔

فکر کی ضرورت

اگر ہم نے ایسے خطرناک حالات میں اپنی آئندہ نسل کے عقیدہ کی حفاظت کی فکر نہ کی، اس کے لیے کوششیں نہ کیں، تو ڈر ہے کہ خدانخواستہ آخرت میں اس بات پر ہماری گرفت نہ ہو کہ ہم نے اپنے بچوں کو ایسے اسکولوں میں کیوں بھیجا، جہاں صحیح دینی تعلیم کا نظم نہ تھا، اللہ تعالیٰ نے سب سے بڑھ کر مسلمانوں کو یہ ذمہ داری دی ہے کہ وہ علم کا رشتہ خالق سے مربوط کر کے علم میں ترقی کریں، اسلام کے اخلاقی نظام کو بھی قائم رکھیں، تمام دنیا کو اس علم کے ذریعہ فائدہ پہنچائیں، امت مسلمہ کو آخری وحی کے ذریعہ سب سے پہلے یہی پیغام دیا گیا ہے، اس لیے اس امت کا فرض منصبی یہ ہے کہ یہ امت علم کو اپنے ہاتھ میں رکھے، اس کی اصلاح کرے، اور اس کو صحیح رخ دے، اسی کے ساتھ علم کو اخلاقی نظام سے ایسا مربوط کردے کہ دین و دنیا دونوں میں توازن قائم رہے، یہ کام اس امت کے لیے نہایت آسان ہے، اس لیے کہ اس کے پاس عقیدۂ توحید ہے، اللہ کی خشیت ہے، حضور پاک علیہ الصلاۃ والسلام کی شریعت ہے، صحابہ کرام کے نظام اخلاق کا وہ نمونہ ہے جس سے بڑھ کر دنیائے انسانیت نے نہ دیکھا ہے، نہ دیکھ سکتی ہے، حقیقت یہ ہے کہ اگر ان تمام باتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے امت مسلمہ علم کی کمان اپنے ہاتھ میں لیتی تو دوسرے مذاہب کے ماننے والے بھی ان کی خدمات ماننے پر مجبور ہوتے، اپنے بچوں کو ایسے اسکولوں میں پڑھانے پر فخر محسوس

کرتے، جہاں علم کے ساتھ نظام اخلاق بھی عطا کیا جاتا ہو، والدین کے ساتھ حسن سلوک کی تعلیم دی جاتی ہو، پڑوسی کے حقوق کا پاس رکھنے کی تعلیم دی جاتی ہو، رشتہ داریوں کے نباہنے پر زور دیا جاتا ہو، انسانیت نوازی کی تعلیم سے آراستہ کیا جاتا ہو، موجودہ دور میں گرچہ عیسائی مشنریز کے اسکول بہت ترقی یافتہ سمجھے جاتے ہیں، مگر اس حقیقت کا ہر ایک کو اعتراف ہے کہ یہاں پڑھنے والے بچے انسان کو انسان نہیں سمجھتے، ماں باپ کو گولیاں مارنے پر تیار رہتے ہیں، پڑوسی کا کوئی حق نہیں سمجھتے، گویا وہاں سے فراغت کے بعد وہ کسی درندہ یا جانور کی شکل اختیار کر لیتے ہیں، جس کو کسی بھی انسان پر ترس نہیں آتا، خواہ وہ اس کے والدین یا اعزاء اقرباء ہی کیوں نہ ہوں، چند منافع کے حصول کے لیے وہ ہر ایک کو دھوکہ دینا جائز سمجھتے ہیں، اس لیے کہ ان کو صرف خود غرضی ہی کی تعلیم دی جاتی ہے، یہی وجہ ہے کہ آج ایسی فحش باتیں سامنے آرہی ہیں جن کا تذکرہ بھی مناسب نہیں۔

موجودہ دور کی تعلیم

موجودہ دور کی تعلیم کی خصوصیت یہ ہے کہ اس نے جہالت کے بہت سے کاموں کو فن بنا دیا ہے، جس سے جاہلیت والا کام علم کی آڑ میں بآسانی کیا جاسکتا ہے، برادر مخدوم و معظم مولانا سید عبداللہ حسنی ندویؒ فرماتے تھے کہ آج جہالت پڑھ لکھ گئی ہے، ایک زمانہ وہ تھا کہ چور کھلے عام جیب کاٹتا تھا، لیکن آج کا زمانہ ایسا ہے کہ انسان سر عام چوری نہیں کرتا بلکہ ڈاکٹر بن کر لوگوں کی کڈنیوں، گردوں اور جسم کے اعضاء چوری کرتا ہے اور اس سے اپنا بیلنس بڑھاتا ہے، کیونکہ پڑھنے کے زمانہ میں لاکھوں، کروروں روپے دے کر علم حاصل کیا تھا، گویا حصول علم کی راہ میں اپنی جیب کٹائی تھی، لہٰذا جب علم حاصل کر لیا تو پڑھ لکھ کر انسانیت کی خدمت کے بجائے ان کی جیب کاٹنا شروع کر دی تاکہ تلافی مافات کی جاسکے، اس قسم کی چوری کے واقعات اخبارات میں چھپنا عام بات ہے، یہاں یہ بھی واضح رہے کہ

سماج میں صرف اسی ذہنیت کے ڈاکٹر نہیں، بلکہ ایسے ڈاکٹر بھی موجود ہیں جن کے اندر محبت کی کسک ہے، انسانیت کا درد ہے، مگر افسوس کی بات یہ ہے کہ اس کے ساتھ ساتھ ہمارے معاشرہ میں بعض ایسے لوگ بھی موجود ہیں جو درندہ صفت نظر آتے ہیں، حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ نے اپنی ایک تقریر میں اسی افسوس کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا:

''آج کے نظام تعلیم نے یہ نہیں سکھایا کہ خدا کیا ہے؟ اس نے تو یہ سکھایا ہے کہ جہاں اپنی عزت کا سوال ہو، جہاں تم کو ذاتی نفع ہو رہا ہو، وہاں اس نفع کو حاصل کرنے کے لیے اپنے وطن اور اپنی عزت کو نیلام کردو، اسی وجہ سے آج انسان انسان کا سودا کر رہا ہے، آج انسان بک رہا ہے، پارٹیاں بک رہی ہیں، تیس چالیس برس کی وفاداریاں بک رہی ہیں، آج ہماری پارلیمنٹ اور اسمبلیاں نخاس کی طرح ہوگئی ہیں، جہاں خلیج بنگال سے لے کر پنجاب تک لوگ بھیڑ بکریوں اور خربوزوں کی طرح بک رہے ہیں، یہ سب اسی نظام تعلیم کا لازمی نتیجہ ہے''۔ [تکبیر مسلسل، ص:۳۱۳-۳۱۴]

وقت کی اہم ضرورت

علم کا صحیح استعمال نہ ہونے کے سبب ملک کی بگڑتی صورت حال ہمارے سامنے ہے، ہر شخص اس بات کو بخوبی سمجھ رہا ہے کہ آہستہ آہستہ اس ملک میں بھی یورپین کلچر Develop ہو رہا ہے، جس کے اندر انسانیت فروشی کے سوا کچھ نہیں، لہٰذا ان حالات میں مسلمانوں کی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنا نصاب ونظام تعلیم ترتیب دینے کی طرف توجہ دیں، اللہ کا شکر ہے کہ بعض فکر مند افراد اس سلسلہ میں کوشش کر رہے ہیں، اور اس کے اچھے نتائج بھی سامنے آرہے ہیں، مگر ابھی اس کی ضرورت ہے کہ اس سے کہیں بڑے پیمانہ پر یہ کوششیں کی جائیں کہ علم کو دو خانوں میں تقسیم نہ کیا جائے، علم کو ایک اکائی سمجھا جائے، اور انسانیت کے لیے درپیش خطرات کو دور کیا جائے، علم کو انسانیت کے حق میں مفید بنانے کی کوشش کی جائے۔